اچھراں کے محل کا چراغ بجھ گیا۔

وہ بازاروں میں پھرنے لگی۔

ظفر کا وجود پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ سارا جسم سُن اور دماغ ماؤف تھا۔ اپنا گھر زندان، ہوائیں دشمن، اور موسم زہر آگیں ہو گیا۔ وہ بیک وقت ظفر تھا بھی اور نہیں بھی۔ وہ سائیکلوجی کا طالب علم تھا اور سائیکلوجی سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ورٹیگو کے مریض کی طرح ساری کائنات اس کے گرد گھوم رہی تھی۔ اس کے اندر اس کا اپنا وجود لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ وہ لوناں ماتا کے سامنے پورن کی طرح کھڑا تھا۔

ملک صاحب سے شادی کے دسویں دن رشو میسن روڈ سے گلبرگ میں منتقل ہو گئی۔ یہ کوٹھی مین بولے وارڈ پر فوارے سے کچھ ہٹ کر داہنی طرف تھی۔ چار کینال کی اس کوٹھی کا کرایہ سات سو روپے تھا۔ اس کے برآمدے کے ستونوں میں کوٹے کا سنگ مرمر اور غسل خانوں میں پلاسٹک کی ٹائلیں لگی تھیں۔ کوٹھی سڑک سے کسی نودولتیے بنک کی عمارت لگتی تھی۔ کوٹھی کے بائیں طرف اونچے اونچے شیشے لگے تھے جیسے ہسپتالوں میں سرجری کا وارڈ ہوا کرتا ہے۔ رشو عموماً یہاں بیٹھ کر سڑک کی جانب دیکھا کرتی تھی۔ اس برآمدہ نما لاؤنج سے آگے ڈرائنگ روم تھا جس میں پانچ ہزار کا قالین اور آٹھ دس ہزار کا فرنیچر تھا۔ اس کمرے کو دیکھ کر پیرس یا روم میں پاکستانی سفارت خانے کا خیال آتا تھا۔ ہر چیز قیمتی، نفیس اور ستھرے مذاق کی آئینہ دار تھی۔ ڈرائنگ روم سے ایک زینہ اوپر ماسٹر بیڈ روم

کر جاتا تھا۔ وہ ماسٹر بیڈ روم جس میں ملک صاحب اور رشّو جان رہتے تھے۔ باقی تمام کمرے اس سوئمنگ پول کی طرح بے آباد اور آراستہ تھے جس کے مالک تیرنا نہ جانتے ہوں۔ اس ماسٹر بیڈ روم میں سفید فرانسیسی فرنیچر تھا۔ سفید ایرانی قالین تھا۔ سفید ساٹن نائیلون کے پردے تھے۔ اور سڑک کی جانب کھلنے والی ایک آئینے کی دیوار تھی۔ جس کے سامنے چیکو سلواکیہ کی بنی ہوئی لیس کے سفید پردے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر لمبے لمبے روشنوں کی کاسنی زرد بوتلیں اور چاندی میں مڑھے ہوئے کنگھے اور برش تھے۔ یہ کمرہ کھلے سیپ کی طرح روشن اور آبدار موتی کی طرح بے داغ تھا۔

اٹیچ باتھ کا رنگ نوزائیدہ چوزے کی طرح ہلکا زرد تھا۔ ٹائلیں زرد، ٹب زرد، فلش زرد، سنک زرد۔۔۔۔ ٹب کے گرداگرد لگا ہوا پلاسٹک کا پردہ زرد رات کے وقت جب ٹب میں گرم پانی بھر کر باتھ سولٹ ڈال کر رشّو چھوٹے سے برش سے اپنی پیٹھ صاف کرتی تو یکدم اسے آناں یاد آجاتیں جو بورے کی انگیٹھی پر تیل میں آلو کی بھاجی پکایا کرتی تھیں۔

وہ کالج سے چھٹی پر تھی۔

ملک صاحب اپنے گھر والوں کے لئے کراچی جا چکے تھے۔ نہ رشّو نے ابھی آناں کو اطلاع دی تھی۔ اور نہ ہی ملک صاحب نے ابھی گھر پر اپنی شادی کا ذکر کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زیادہ دیر یہ خبر چھپ نہیں سکے گی لیکن جب تک وہ کبوتر کی

طرح آنکھیں بند کئے خطرے سے بچ سکتے تھے تب تک بچنا ان کا فرض تھا۔

اس نئی شادی نے ان کے سارے وجود کو گوبھی کے پتوں کی طرح چوڑائی بخش دی تھی۔ آج تک وہ پیسہ خرچ کرتے وقت ہمیشہ لمحہ بھر کو سوچا کرتے تھے۔ لیکن اب ان کا بنک بلینس پرنالے کی طرح بہہ رہا تھا اور وہ خوش تھے۔

رشو چاندی کے برش سے بال بناتی تو وہ پشت پر کھڑے ہو کر آئینے میں اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ رشو ٹب میں نہاتی تو وہ پلاسٹک کے پردے کے پاس نظریں جھکا کر اس سے باتیں کرتے۔ رشو سو جاتی تو وہ بیڈ لیمپ جلا کر رشو کے کندھے دیکھتے۔ اس کی گردن کے سنگِ مرمر پر انگلیاں پھیرتے۔ ابھی انہیں گلبرگ میں آئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک رات رشو بہت جلد سو گئی۔ آدھی رات کو رشو نے محسوس کیا جیسے کوئی کنکھجورہ اس کی گردن پر رینگ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ دیکھا تو بیڈ لیمپ روشن تھی۔ اور ملک صاحب اس کے پاس بیٹھے تھے....

"کیا کر رہے ہیں آپ اس وقت؟"

"میں؟..... کچھ نہیں..."

"پھر بھی آپ جاگ کیوں رہے ہیں۔"

"بس یونہی.... نیند نہیں آتی۔"

"لیکن آپ کر کیا رہے تھے۔"

ملک صاحب جھینپ گئے...

"بتایئے ناں کیا کر رہے تھے آپ؟"

"میں تمہاری گردن...."

"ہائے اللہ آپ تھے۔ میں سمجھی تھی کنکھجورہ ہے کوئی..."

لجاجت سے ملک صاحب بولے...

"نہیں میں ہی تھا..."

"تو پھر سو جایئے اب"

"نیند نہیں آتی رشّو!"

"کوشش کیجئے..."

"بہت کوشش کی ہے" لجاجت سے ملک صاحب نے نظریں جھکا کر کہا۔

"آپ... فکر کرتے ہیں..."

"کیسا فکر"

"اپنے گھر والوں کا خوف ہے آپ کو اور کیسا فکر"

گھبرا کر ملک صاحب نے دائیں بائیں سر ہلایا۔

"مجھے بھی تو بہار پور واپس جانا ہے۔ مجھے بھی تو اماں کو کچھ جواب دینا ہوگا"

"تم فکر نہ کرو.... میں ساتھ چلوں گا تمہارے... ہم... اماں کے پاؤں پڑ جائیں گے" ملک صاحب نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو رشّو نے جلدی سے

ہاتھ چھڑا کر کہا۔۔۔

"اچھا سو جائیے اب۔"

"پتہ نہیں کیا بات ہے نیند نہیں آتی۔"

"تو کوئی سلیپنگ پلز کھا کر سو جائیے۔"

ملک صاحب خاموشی سے اٹھے اور خواب آور گولیاں کھا کر چپ چاپ لیٹے گئے۔۔۔

ماسین نے روڈ کی اور بات تھی۔ وہاں ڈمپل تھی۔ اس کے آباجی تھے۔ ڈمپل کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ ایک گھریلو ماحول تھا۔۔۔ یہاں ان لوگوں سے کٹ کر آسائش کی گود میں پہنچ کر اس کا محبوب ترین مشغلہ ملک صاحب کو دیکھنا رہ گیا تھا۔ وہ ہنٹر پھڑکاتی اور شیر کرسی پر بیٹھ جاتا۔ وہ چمڑے کا سانٹا سر پر گھماتی اور ہاتھی ناچنے لگتا۔۔۔ وہ شوں شوں کرتی اور کتا دونوں ہاتھ اٹھا کر ہڈی مانگنے لگتا۔

آسائش میں بس ایک ہی قباحت ہے کہ پہلے انسان اس کا متمنی ہوتا ہے۔ پھر اس کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر اسے اپنا پیدائشی حق سمجھ کر نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر کی ہر چیز اپنا نیا پن کھو چکی تھی۔۔۔ رشو ان چیزوں کے لئے پیدا ہوئی تھی۔۔۔ اور وہ دل سے سمجھتی تھی کہ وہ ایسے ہی گھر ایسی ہی آسائشوں کے قابل تھی۔۔۔ پہلے تو اُسے اپنی زندگی نے بے حد متاثر کیا۔ وہ کچھ روز اپنی قسمت پر نازاں بھی رہی

یکے دم رشّو کو محسوس ہوا جیسے زندگی کا واحد سنہری موقع اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔ وہ ظفر کے قدموں میں قالین پر بیٹھ کر جلدی جلدی بولنے لگی۔

"میں ۔۔۔ میں اپنی غلطی پر پشیمان ہوں ۔۔۔ میں اپنی ۔۔۔ میں اگر تم سے معافی مانگوں تو بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا ۔۔۔ میں جانتی ہوں میں جانتی ہوں کہ میرے لئے کوئی امید نہیں پھر بھی ۔۔۔۔ میں تم سے معافی کی طلبگار ہوں۔"

"جو باب بند ہو چکا ہے اسے مت کھولیئے۔"

رشّو نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے کجاول کی انگیٹھی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ظفر نے جلدی سے اپنا ہاتھ علیحدہ کر لیا۔

"خدا حافظ رشّو۔"

رشّو دونوں باہنیں ڈال کر ظفر کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"نہ جاؤ۔ خدا کے لئے نہ جاؤ ۔۔۔ میں اس دنیا میں تنہا ہوں میرا کوئی نہیں۔ میں تم سے کبھی کچھ نہ چاہوں گی ۔۔۔ سوائے محبت کے ۔۔۔ میں تم سے کچھ نہ مانگوں گی سوائے پیار کے ۔۔۔ ظفر ۔۔۔ سنو تو ۔۔۔ یوں بت بنے مجھے کیا دیکھ رہے ہو۔ بولو ۔۔۔ خدا کے لئے ۔۔۔ میں تم سے اس محبت کی بھیک مانگ رہی ہوں جو تم ۔۔۔ تم مجھے پہلے ہی دے چکے ہو ۔۔۔ پہلے ہی ۔۔۔ سنو ۔۔۔ بولو تو ۔۔۔ کچھ تو کہو۔"

"خدا حافظ ۔۔۔"

"میرے ساتھ ادھر چلو ۔۔۔ آؤ ۔۔۔"

"میری ٹانگیں چھوڑ دو رشو۔"

سسکیوں اور آنسوؤں سے گھلی ہوئی موم کی پتلی نے اس کی پتلون کے پائنچے کو بوسہ دیا اور علیحدہ ہو گئی۔

چیرا پونجی کے بادل جنگل پر برس رہے تھے۔ اور انگارے کی دہکتی ہوئی آگ بجھی ہوئی لکڑیوں میں بدل رہی تھی۔ سیاہ کوئلوں کی راکھ بن رہی تھی۔

"تم جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"ایک بار میرے شوہر سے نہیں ملو گے۔"

"نہیں۔"

"میں تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔"

"تم بعد میں میری شکایت ان سے کر دینا۔"

"پھر آؤ گے؟"

"نہیں۔"

"یاد رکھنا سنگدلی کا سبق میں نے تم سے سیکھا ہے۔"

"خدا حافظ!"

"ہیروشیما سے کم تباہ حال نہیں ہوں میں .... میرے لئے تمہارے پاس ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں؟"

"خدا حافظ!"

"ظفر! خدا کے لئے!"

"خدا حافظ...."

"خدا حافظ...."

دروازہ کھلا اور رات کی تاریکی اسے چاٹ گئی۔ کچھ لمحے رشّو نے اس آہٹ کے سہارے جینا چاہا جو اس کے دل سے آ رہی تھی... پھر وہ دیوانہ وار سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔ ملک صاحب سلیپنگ پلز کی نیند سو رہے تھے۔ ان کے نرخرے سے خشک شوں کی آواز آ رہی اور رہی نکال رہی تھی۔ چہرے پر ویزلین کی چمک اور سانس میں وٹامنز کی خوشبو.... شنگھائی کے ریشم کا گرے اور سبز لائنوں والا نائٹ سوٹ پہنے وہ بستر پر چاروں شانے چت لیٹے تھے، جیسے گندم کے کھیت میں پرندوں کو ڈرانے والا اُلٹا اوندھے منہ گرا ہو۔

رشّو نے ملک صاحب کے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

"اٹھو..... ! ..... اٹھو!"

خشک شوں کی آواز بند ہو گئی۔

"اٹھو ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔"

سہما سہما سانس آنے لگا۔

کالر کی پٹی پکڑ کر یکبارگی رشّو نے ملک صاحب کو اٹھانا چاہا۔ لو کرے اور ریشم

سبز لائنوں والی پٹی جھر رسے اس کے ہاتھ میں آرہی... ریڈی میڈ سوٹ کے تمام بٹن چھناکے سے ٹوٹے اور رشو کے آنسوؤں کی طرح ادھر ادھر بکھر گئے....

شہر کی بتیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں...

اور ظفر چلا جارہا تھا۔ کپل وستو کا کنور... راجہ گوپی چند چلا جارہا تھا۔ نالہ بڈیارہ اور بڈھے دریا کی آبادی اس کے بہت پیچھے رہ گئی تھی... اتنے بڑے شہر میں اتنے گنجان آباد شہر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی.... وہ ہجرت کر رہا تھا۔ کفار کی بستی چھوڑ رہا تھا جہاں کے مظالم سے اس کی چھاتی چھلنی ہوگئی تھی۔ شہر کی بتیاں دور تک اسے چھوڑنے آئیں۔ اور پھر سسکیں ہوا کر لوٹ گئیں۔ شہر کے شور نے دیر تک اس کا تعاقب کیا۔ اور پھر کنوئیں کے پانی کی طرح دور رہ گیا.... وہ اس شہر کی ایک ہی سوغات ساتھ لئے جارہا تھا۔ اس کا اس شہر سے ایک ہی رشتہ باقی رہ گیا تھا... بے وفا محبوبہ اور سوتیلی ماں کا رشتہ....

بتیاں دور رہ گئی تھیں۔

آوازیں دب گئی تھیں۔

اور وہ چلا جارہا تھا.... آہستہ آہستہ... خشک زمین میں بجبر آنسو بوتا...

دکھنی مغل بچے نے کہا:

اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا

سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گزرا اس کے رنگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے
اس پر راضی ہوں لیکن آرزو کرنا آئینِ عبودیت کے خلاف نہیں۔۔ میری آرزو
ہے کہ اب زندہ نہ رہوں اور اگر رہوں تو کم از کم اس ملک میں نہ رہوں۔۔۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

روٹری آفسٹ مشین کا سلنڈر بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ اور اخبار کا
پہلا اور آخری صفحہ چھاپ چھاپ کر سامنے سٹک کے جنگلے میں پھینک رہا تھا۔۔۔

(نمائندہ خصوصی)

گلبرگ کی پر رونق اور باوقار آبادی میں کل رات لاہور کے
لکھ پتی تاجر ملک بختیار علی اپنے کرائے کی کوٹھی میں قتل کر دیئے گئے۔ یہ
بنگلہ سفیدے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ اس کے
چاروں کونوں پر سفیدے کے فلک بوس درخت ایستادہ ہیں۔ مبینہ
اطلاع کے مطابق ملک بختیار نے تقریباً ایک ماہ پیشتر بہاولپور کی
طالبہ سے خفیہ طور پر شادی کی تھی اور اپنے گھر والوں سے چوری دونوں
میاں بیوی اس کوٹھی میں بڑی پُراسرار زندگی بسر کر رہے تھے۔۔۔ کل
صبح جب ان کا خانساماں ناشتے کی ٹرالی دھکیل کر اندر لے گیا تو
ملک صاحب خون میں لت پت اپنے بستر پر مردہ پڑے تھے اور ان
کے پہلو میں ان کی نوجوان بیوی نیم برہنہ حالت میں لیٹی ہوئی تھی۔۔۔